تفسیری اختلافات میں تطبیق، سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ کی روشنی میں

Compatibility of Exegetical Contradictions in the Light of Surah Al-Fatiḥa and Surah Al-Baqarah

Hafiz Falak Sher Faizi
Lecturer, Department of Islamic Studies, University of Narowal,
Narowal: hafizfalakshair@yahoo.com
Mazhar Hussain
Lecturer, Department of Islamic Studies, University of Narowal,
Narowal: mazhar.hussain@uon.edu.pk

Abstract

The Holy Qur'ān has been revealed upon the last Prophet Muḥammad (SAW). The Qur'ān is the embodiment of guidance, and Tafsīr is always a lighthouse for further understanding and clarity. One, therefore, cannot live without Tafsīr-al-Qur'ān. There are various ways to do Tafsīr and different scholars keeping in view their methodogical paradigm and eras, have done so in their particular ways and styles. This kind of variation resulted into contradictions in the views. Consequently, a common reader gets confused whenever he reads the variety in the Tafsīr. He takes the whole thing full of errors and contradictions. As the text is same, the contradictions in Tafsīr evolve doubt and confusions that is to be setteled and handled. Thus, the present study is about the contradictions in Tafsīr and the solutions. It embodies the reality of the contradictions in Tafsīr and expresses the ways of bridging the gaps among them. Examples have been given to elaborate the concept. It can be concluded that contradictions in exegetical interpretation of any text is natural due to various academic and cultural backgrounds of commentators but it may be adjustable through applying different rules of compatibility.

Keywords: Qur'ān, Tafsīr, Contradictions, Confusion, Compatibility

تفسیری اختلافات ایک فطری اور مثبت چیز ہے۔ اس کی بنیادیں تفسیری اختلافات کے اسباب کی صورت میں تفسیر میں موجود ہیں۔ تفسیری اختلافات کا مصدر ایک ہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تفسیری اختلافات قرآن مجید کی تفسیر سے ہی لئے جاتے ہیں۔ اس بات پر تو سب متفق ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی بھی اختلاف نہیں ہے۔ جب

قرآن میں کوئی اختلاف نہیں ہے، تو اس کی تفسیر میں اختلاف کے درمیان تطبیق ممکن ہے۔ اگر یہ اختلاف کسی دلیل کی بنیاد پر ہے، تو اس اختلاف کو با آسانی حل کیا جاسکتا ہے کیونکہ اصل بنیاد تو ایک ہی ہے اور وہ قرآن ہے۔

تفسیر کے زیادہ تر اختلافات تنوع کے اختلافات ہیں، ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہوتا، اس لئے ان کے درمیان تطبیق ممکن ہے۔ اس بحث میں سارے تفسیری اختلافات کے درمیان تطبیق پیدا نہیں کی جائے گی بلکہ اس کے چند پہلو بیان ہوں گے۔ ان کی وضاحت کے لئے سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ سے چند مثالیں بیان ہوں گی جن کی مدد سے تفسیری اختلافات میں تطبیق کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ سارے تفسیری اختلافات میں تطبیق پیدا کی جائے، یہ ایک وسیع موضوع ہے جس میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تفسیر کے اختلافات کے درمیان تطبیق کا ایک مفہوم واضح کیا جائے اور یہ بیان کیا جائے کہ تفسیری اختلافات کوئی بری چیز نہیں ہے، ان کے درمیان تطبیق ممکن ہے۔

تفسیری اختلافات کا مفہوم:

قرآن مجید کے کسی ایک لفظ یا آیت کے معنی و تفسیر میں مفسرین مختلف اقوال ذکر کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اسے تفسیری اختلافات کہا جاتا ہے۔ ایک ہی آیت کی تفسیر میں کئی اقوال و آراء سامنے آتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی آیت کی تفسیر میں مختلف طریقے اور انداز نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات ان اختلافات کے درمیان تطبیق ممکن ہوتی ہے، اس وقت یہ اختلاف، نوعیت کا اختلاف ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ان کے درمیان تطبیق ممکن نہیں ہوتی تو اس وقت یہ اختلاف، تضاد کا اختلاف ہوتا ہے۔ تفسیری اختلافات کی وضاحت درج ذیل مثال سے کی جاتی ہے۔

1۔ سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾[1] "ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔"

اس آیت میں "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" کی تفسیر میں مفسرین کے کئی اقوال ملتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ "صراط مستقیم" سے مراد "اسلام" ہے۔ ابو العالیہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد نبی ﷺ اور

[1]۔ الفاتحہ، 6:1

Al Qur'ān,1:6

آپ ﷺ کے بعد آپؐ کے صاحبین ہیں۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ اس سے مراد "کتاب اللہ" ہے۔[2] یہ تین اقوال ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس طرح سے ایک ہی آیت کی تفسیر میں تین مختلف اقوال وارد ہوئے ہیں۔ لہذا اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے۔

تفسیری اختلافات کی نوعیت اور اقسام

تفسیری اختلافات عام طور پر نوعیت کے اختلافات ہیں۔ ان میں تعارض اور تضاد بہت کم پایا جاتا ہے۔ لیکن جب عام قاری ان تفسیری اختلافات کو دیکھتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان میں تعارض اور تناقض پایا جاتا ہے۔ اگر ان کو غور سے دیکھا جائے تو ان کے درمیان تعارض اور تضاد بہت کم ہوتا ہے بلکہ ان کے درمیان تطبیق کا امکان ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تفسیر میں پائے جانے والے زیادہ تر اختلافات نوعیت کے اختلافات ہیں جن کے درمیان تطبیق ممکن ہے۔ جبکہ تضاد کے اختلافات بہت ہی کم ہیں جن کے درمیان تطبیق ممکن نہ ہو۔ تفسیری اختلافات مجموعی طور پر دو طرح کے ہیں، دراصل ان کی یہی دو اقسام ہیں۔

1۔ اختلاف تنوع / اختلاف نوعیت　　2۔ اختلاف تضاد / اختلاف تعارض

1۔ اختلاف تنوع / اختلاف نوعیت

اختلاف تنوع یہ ہے کہ ایک آیت کی تفسیر میں کئی اقوال یا آراء پائی جاتی ہیں جن میں تنوع ہوتا ہے، یعنی ان کی نوعیت میں فرق پایا جاتا ہے۔ ان کے درمیان کوئی تضاد یا تعارض نہیں ہوتا۔ اسی لئے ان کے درمیان تطبیق کا امکان بھی پایا جاتا ہے۔

2۔ ابن کثیر، عمر بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، تحقیق، مصطفی السید محمد، مؤسسہ قرطبہ، قاہرہ، طبع اول، 2000ء، 1/219-221

Ibn Kathīr,'Umar bin Kathīr, Tafsīr al-Qur'ān al-Azīm, Taḥqīq, Muṣṭafā al-Sayyed Muḥammad, Cordoba Institute, Cairo, first edition, 2000 AD, vol.1, p.219-221

2۔اختلاف تضاد:

تفسیری اختلاف کی دوسری قسم "اختلاف تضاد" ہے۔اس میں ایک آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال وارد ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔اگر ان میں سے ایک قول کو قبول کیا جائے تو دوسرا رد ہو جاتا ہے۔[3] اختلاف تضاد میں مختلف اقوال کے درمیان تضاد یا تعارض پایا جاتا ہے۔

تطبیق کا معنی و مفہوم:

عربی زبان میں تطبیق کے مختلف معانی ہیں لیکن اردو زبان میں تطبیق کا لفظ "مطابقت" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔مصباح اللغات میں ہے:"طابقه طباقا و مطابقة :موافقت کرنا۔طابق بين الشيئين :دونوں کو ایک طریقہ پر کرنا۔"[4] لہذا تطبیق کے معنی "مطابقت اور موافقت" کے ہیں۔دو چیزوں کے درمیان تطبیق پیدا کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے درمیان موافقت پیدا کی جائے اور ان کو ایک ہی طریقے پر لایا جائے۔

اختلاف تنوع میں تطبیق کی پہلی صورت: مختلف تعبیرات سے ایک ہی معنی کی تعبیر

اختلاف تنوع میں تطبیق کی پہلی صورت یہ ہے کہ ایک آیت کی تفسیر میں بعض اقوال و آراء وارد ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔اگر ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ سب ایک ہی معنی کو بیان کرتے ہیں۔حقیقت میں یہ سب اقوال ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور ان میں صرف تعبیر کا فرق ہوتا ہے جبکہ ان کے معنی میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔اس کی وضاحت اس طرح سے ہے کہ مفسرین ایک ہی لفظ کی تفسیر میں مختلف الفاظ اور تعبیرات استعمال کرتے ہیں۔ایک مفسر ایک تعبیر استعمال کرتا ہے تو دوسرا مفسر دوسری تعبیر استعمال کرتا ہے۔سب کا مقصود ایک ہی چیز ہے یعنی سب ایک ہی معنی بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تضاد یا تعارض نہیں ہوتا۔اس کی وضاحت چند مثالوں سے کی جاتی ہے۔

---

[3]۔ابن کثیر، عمر بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ص146

Ibn Kathīr,'Umar bin Kathīr, Tafsīr al-Qur'ān al-Azīm, p-146

[4]۔عبد الحفیظ، مصباح اللغات، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، 1999ء، ص482

Abdul Ḥafīz, Miṣbāḥ-al-Lughāt ,Maktab-e-Quddusiyyah, Laḥore,1999, ,p.482

مثال 1: "یَوْمِ الدِّینِ" کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾[5] "روز جزاء کا مالک ہے۔"

اس آیت میں "یَوْمِ الدِّینِ" کی تفسیر میں مختلف اقوال وارد ہوئے ہیں:

1. پہلا قول یہ ہے کہ "یوم الدین" سے مراد "حساب کا دن" ہے۔[6]
2. دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد "جزاء کا دن" ہے۔[7]

اختلاف کی حقیقت:

یہ اختلاف نوعیت کا اختلاف ہے، اس میں کوئی تضاد نہیں۔ اس میں ایک ہی معنی کی تعبیر دو مختلف اقوال سے کی گئی ہے جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

اختلاف میں تطبیق:

جزاء کے دن اور حساب کے دن میں ایک ہی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ دراصل اس سے مقصود قیامت کا دن ہے جس میں حساب اور جزاء دونوں ہوں گے۔ حساب اور جزاء دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ یہاں پر ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہی معنی کی تعبیر کرتے ہیں۔

5۔ الفاتحہ، 4:1

Al Qur'ān,1:4

6۔ طبری، ابو جعفر محمد بن جریر، جامع البیان عن تاویل آئۃ القرآن، تحقیق، ڈاکٹر عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، دار الہجر، قاہرہ، طبع اول، 2001ء 1/29

Al-Ṭabarī, Abū Ja'far Muḥammad bin Jarīr, Jami' al-Bayān an T'awīl āya al-Qur'ān, Taḥqīq, Dr. Abdullah bin Abdul Muḥsin al-Turkey, Dar al-Ḥijr, Cairo, first edition, 2001.Ad, vol.1,p.29

7۔ ابن ابی حاتم، عبد الرحمن بن محمد بن ادریس الرازی، تفسیر القرآن العظیم مسندا عن رسول اللہ والصحابۃ والتابعین، تحقیق، اسعد محمد طیب، مکتبہ نزار مصطفی الباز، ریاض، طبع اول، 1997ء، 1/29

Ibn Abī Ḥātim, Abd al-Raḥmān bin Muḥammad bin Idrīs al-Rāzī, Tafsīr al-Qur'ān al-Azeem Musnad an Rasoolullah wa al-Saḥābah wa al-Tabi'īn,Taḥqīq, As'ad Muḥammad Tayyib, Maktaba Nizar Muṣṭafa al-Bāz, Riyād, 1st Edition, 1997 Vol.1, p.29

مثال2:"الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيم"کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

سورۃالفاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایاہے:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيم﴾ [8] "ہمیں سیدھاراستہ دکھا۔"

اس آیت میں "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيم" کی تفسیر میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں:

1. حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ "صراط مستقیم" سے مراد "اسلام" ہے۔[9]
2. ابوالعالیہؒ سے مروی ہے کہ اس سے مراد "نبی ﷺ اور آپؐ کے بعد آپؐ کے صاحبین" ہیں۔[10]
3. حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ اس سے مراد "کتاب اللہ" ہے[11]
4. ابن الحنفیہؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد "اللہ کا دین" ہے۔[12]
5. مجاہدؒ کا قول ہے کہ اس سے مراد "حق" ہے۔[13]

اختلاف کی حقیقت:

مذکورہ بالا اقوال کے درمیان نوعیت کا اختلاف ہے ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ یہ سب اقوال ایک ہی معنی کی تعبیر کرتے ہیں۔

---

[8]۔الفاتحہ،1:6

Al Qur'ān.1:6

[9]۔ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر،ج1،ص221

Ibn Kathīr, Tafsīr Ibn Kathīr, vol.1, p221

[10]۔ایضا

Ibid

[11]۔ایضا،ص218

Ibid,p:218

[12]۔ایضا،ص220

Ibid,p:220

[13]۔ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم،ج1،ص30

Ibn e Abī Ḥātim, Tafsīr ibn Abī Ḥātim, vol-1,p:30

اختلاف میں تطبیق:

دراصل "صراط مستقیم" کا معنی "سیدھا راستہ" ہے۔ اس آیت میں اس سے مقصود اللہ کا وہ سیدھا راستہ ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے وضع کیا ہے۔ مذکورہ بالا تمام اقوال اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پہلے قول کے مطابق "اسلام" سیدھا راستہ ہے جو اللہ کی طرف لے کر جاتا ہے، اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔ دوسرے قول میں "نبی ﷺ اور آپؐ کے صاحبین" سیدھے راستے کی ایک مثال ہے جو اللہ کی طرف لے کر جاتا ہے۔ تیسرے قول میں "کتاب اللہ" سیدھا راستہ ہے کیونکہ یہ سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ چوتھے قول میں "اللہ کا دین" بھی سیدھا راستہ ہے کیونکہ یہ سیدھا اللہ کی طرف لے کر جاتا ہے اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔ پانچویں قول میں "حق" بھی سیدھا راستہ ہے۔ اصل میں دین اسلام ہی "حق" ہے، جب دین اسلام سیدھا راستہ ہے تو "حق" بھی سیدھا راستہ ہے۔ اس طرح سے یہ سب اقوال ایک ہی معنی کی تعبیر کرتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے صرف تعبیرات کا فرق ہے۔

مثال3: "طُغْيَانِهِمْ" کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾[14]

"اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔ وہ ان کی رسی دراز کئے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔"

اس آیت میں " طُغْيَانِهِمْ" کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ اس کی تفسیر میں درج ذیل اقوال وارد ہوئے ہیں:

1. پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد "کفر" ہے۔ یہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔[15]
2. اس سے مراد "گمراہی" ہے۔ یہ قول قتادہؒ سے مروی ہے۔[16]

---

[14]۔ البقرہ، 15:2

Al Qur'ān,2:15

[15]۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص321

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol-1,p:221

3. اس سے مراد "کفر اور گمراہی دونوں" ہیں۔ یہ قول ابن زیدؒ سے مروی ہے۔[17]

اختلاف کی حقیقت:

یہ نوعیت کا اختلاف ہے۔ یہ سب اقوال ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف میں تطبیق:

عربی زبان میں "طغیان" کا اصل معنی "حد سے تجاوز کرنا" ہے۔[18] مذکورہ بالا تمام اقوال اسی اصل معنی کی تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے قول میں اس کو "کفر" سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ آیت میں مذکور لوگ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور جب وہ اللہ کی نافرمانی میں حد سے تجاوز کرتے ہیں تو کفر میں چلے جاتے ہیں۔ دوسرے قول میں اس کو "گمراہی" سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اللہ کی نافرمانی میں حد سے بڑھ جانا، گمراہی ہے۔ تیسرے قول میں اس کو "کفر اور گمراہی دونوں" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی نافرمانی میں حد سے بڑھ کر گمراہ ہو گئے ہیں اور اس گمراہی میں اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ وہ کفر تک پہنچ چکے ہیں۔ اس طرح سے تینوں اقوال ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور صرف تعبیر کا فرق ہے۔ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

مثال4: "حِطَّةٌ" کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ﴾[19]

---

[16] ۔طبری، تفسیر طبری، ج1، ص321

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol-1,p:221

[17] ۔ایضا

Ibid

18۔ شوقی ضیف، المعجم الوسیط، مکتبۃ الشروق الدولیۃ، مصر، طبع چہارم، 2004ء، ص558

Shawqī Daīf, Al-Mujam al-Wasīṭ, Maktaba alshuruq al Dawliyyah, Egypt, 4th edition,2004,p.558

19۔البقرہ،58:2

Al Qur'ān,2:58

"اور جب ہم نے کہا تھا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ اور دروازے

فضل و کرم سے نوازیں گے۔ "اس آیت میں " حِطَّـةٌ" کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ اس کی تفسیر میں درج ذیل اقوال وارد ہوئے ہیں:

1. "حِطَّـــةٌ" سے مراد "بخشش" ہے۔ یہ قول سعید بن جبیرؒ کے طریق سے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔[20]
2. اس سے مراد "ہم سے گناہوں کو اتار دے" ہے۔ یہ قول حسنؒ اور قتادہؒ سے مروی ہے۔[21]
3. اس سے مراد یہ ہے کہ کہو "لا الہ الا اللہ"۔ یہ قول عکرمہؒ سے مروی ہے۔[22]

اختلاف کی حقیقت:

یہ نوعیت کا اختلاف ہے۔ یہ سب اقوال ایک ہی معنی کی تعبیر کرتے ہیں، حقیقت میں ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف میں تطبیق:

عربی زبان میں "حِطَّةٌ" کا لفظ "حطّ" سے بنا ہے جس کا معنی کسی چیز کو اوپر سے نیچے اتارنے کے ہیں۔[23] پس "حطۃ" کا معنی "اتارنا" ہے۔ اس آیت میں "حِطَّةٌ" کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ بات کہو جس کے ذریعے سے ان کے گناہ، ان سے اتار دیئے جائیں یعنی دور کر دیئے جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے اپنے

20۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص716

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol.1,p.716

21۔ ایضا

Ibid

22۔ ایضا، ص717

Ibid,p:717

23۔ راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، تحقیق، محمد سید کیلانی، دار المعرفہ، بیروت، لبنان، س،ن، ص122

Rāghib Asfahānī, Al-Mufradāt Fī Gharīb Al-Qur'ān, Taḥqīq, Muḥammad Sayed Kalanī, Dār-al-Ma'rifah Beirūt, Lebanon, p.122

گناہوں کو اتارنے کی دعا کریں۔ یہ وہ اصل معنی ہے جس کی طرف اس لفظ کی تفسیر میں وارد مذکورہ بالا تمام اقوال اشارہ کرتے ہیں۔ پہلے قول میں "حِطَّةٌ" کو "مغفرت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مغفرت سے مراد گناہوں کو دور کرنا ہے۔ دوسرے قول میں "گناہوں کو اتارنے" سے تعبیر کیا گیا ہے جو اصل معنی کے مطابق ہے۔ تیسرے قول میں "لا الہ الا اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ وہ عظیم چیز ہے جس کے ذریعے سے گناہ دور ہوتے ہیں۔ اس طرح سے یہ تینوں اقوال ایک ہی معنی کی تعبیر کرتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

مثال5: "وَنُقَدِّسُ لَكَ" کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾[24]

"اور ہم آپ کی حمد وثناء کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرشتوں کا قول ذکر کر رہا ہے کہ وہ اللہ کی تسبیح اور تقدیس کرنے کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس آیت میں "وَنُقَدِّسُ لَكَ" (اور ہم آپ کی تقدیس کرتے ہیں) کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ اس کی تفسیر میں درج ذیل اقوال وارد ہوئے ہیں:

1. "تقدیس" سے مراد "پاکیزگی" ہے۔ یہ قول ضحاکؒ سے مروی ہے۔[25]
2. اس سے مراد یہ ہے کہ "ہم تیری تعظیم کرتے ہیں اور بزرگی بیان کرتے ہیں"۔ یہ قول ابو صالحؒ سے مروی ہے۔[26]
3. اس سے مراد یہ ہے کہ "ہم تیری نافرمانی نہیں کرتے اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جسے تو ناپسند کرتا ہو"۔ یہ قول محمد بن اسحاقؒ سے مروی ہے۔[27]

24۔ البقرہ،30:2

Al Qur'ān,2:30

25۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص506

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol-1,p:506

26۔ ایضا

Ibid

27۔ ایضا Ibid

4. اس سے مراد "صلاۃ" (نماز) ہے۔ یہ قول قتادہؒ سے مروی ہے۔[28]

اختلاف کی حقیقت:

یہ نوعیت کا اختلاف ہے۔ سب اقوال ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف میں تطبیق:

عربی زبان میں "تقدیس" کے معنی "تطہیر" یعنی پاکیزگی کے ہیں۔[29] پہلے قول میں "تقدیس" کی تعبیر "پاکیزگی" سے کی گئی ہے۔ یہ اس کے اسی لغوی معنی کے اعتبار سے ہے۔ دوسرے قول میں "تعظیم اور بزرگی" سے اس کی تعبیر کی گئی ہے کیونکہ اللہ کی پاکیزگی یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس کی تعظیم کریں اور بزرگی بیان کریں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ ہر نقص اور عیب سے پاک ہے تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ہم یہ اقرار کریں کہ وہ عظیم اور بزرگ وبرتر ہے۔ یہ دونوں اقوال ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ تیسرے قول میں تقدیس کی تعبیر "ہم تیری نافرمانی نہیں کرتے اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جسے تو ناپسند کرتا ہو" سے کی گئی ہے۔ یہ بھی پہلے دو اقوال سے ملتا جلتا ہے۔ جب ہم اللہ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں اور اس کے بزرگ وبرتر ہونے کا اقرار کرتے ہیں تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ہم اس کی نافرمانی سے بچیں اور ایسے کام سے اجتناب کریں جو اسے ناپسند ہوں بلکہ اس بزرگ و برتر ذات کی ہمیشہ رضا حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ چوتھے قول میں تقدیس کو "صلاۃ" (نماز) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ کی پاکیزگی، تعظیم اور بزرگی بیان کرنے کی ایک صورت بیان کی گئی ہے کیونکہ نماز میں اللہ کی حمد و ثناء، تعظیم و تطہیر بیان کی جاتی ہے اور یہی تقدیس ہے۔ اس طرح سے یہ سب اقوال ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف تنوع میں تطبیق کی دوسری صورت: "عام" کے بعض اجزاء بیان کرنا

---

[28]۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص505

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol-1,p:505

[29]۔ شوقی ضیف، المعجم الوسیط، ص719

Shawqī Daīf, Al-Mujam-al-Wasīṭ, p. 719

بعض اوقات قرآن مجید میں ایک لفظ "عام" استعمال ہوتا ہے یا کسی آیت میں عموم پایا جاتا ہے۔ مفسرین اس عموم کی مختلف انداز سے تفسیر کرتے ہیں۔ بعض مفسرین عموم کے ایک جز کو بیان کرتے ہیں، تو بعض دوسرے اجزاء کو بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے لیکن ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہوتا۔

ایسے تفسیری اختلاف کے درمیان تطبیق ممکن ہے کیونکہ مفسرین جب اس "عام" کی تفسیر کرتے ہیں تو وہ اس کے بعض اجزاء کو بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح سے اس عام کی تفسیر میں موجود اقوال ایک ہی عام معنی بیان کر رہے ہوتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ اس کی وضاحت درج ذیل مثالوں سے کی جاتی ہے۔

مثال 1: "بِالْغَيْبِ" کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

اللہ تعالیٰ متقین کی ایک صفت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾[30] "جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔"

اس آیت میں "غیب" کی تفسیر میں کئی اقوال وارد ہوئے ہیں:

1. "غیب" سے مراد "وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آیا ہے۔" یہ قول حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔[31]
2. اس سے مراد "اللہ، اس کے فرشتے، کتابیں، رسول، آخرت کا دن، جنت، آگ، اللہ سے ملاقات اور موت کے بعد کی زندگی" ہے۔ یہ قول ربیع بن انسؒ سے مروی ہے۔[32]
3. اس سے مراد "قرآن" ہے۔ یہ قول زرؒ سے مروی ہے۔[33]
4. اس سے مراد "اللہ پر ایمان" ہے۔ یہ قول عطاء بن ابی رباحؒ سے مروی ہے۔[34]

---

[30]۔ البقرہ، 3:2

Al Qur'ān,2:3

[31]۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص242

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol-1,p:242

32۔ ایضا

Ibid

33۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص241

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī, vol-1,p:241

5. اس سے مراد "اسلام کے غیب پر ایمان لانا" ہے۔ یہ قول اسماعیل بن ابی خالدؒ سے مروی ہے۔[35]

6. اس سے مراد "تقدیر" ہے۔ یہ قول زید بن اسلمؒ سے مروی ہے۔[36]

اختلاف کی حقیقت:

یہ نوعیت کا اختلاف ہے۔ اس میں سب اقوال ایک ہی عام معنی کی تعبیر کرتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف میں تطبیق:

عربی زبان میں "غیب" سے مراد "ہر وہ چیز ہے جو انسان کے حواس سے پوشیدہ ہو۔" اس آیت میں غیب کا لفظ عام ہے۔ لہذا آیت میں اس کا معنی یہ ہے کہ متقین ہر اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو انسان کے حواس سے پوشیدہ ہو۔ مفسرین نے اسی عام کے مختلف اجزاء کو بیان کیا ہے۔

پہلے قول میں "اللہ کی طرف سے آئی ہوئی چیزیں یعنی احکام وغیرہ" کو غیب کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومنین نے یہ احکام اللہ سے بذات خود وصول نہیں کئے بلکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ذریعے سے لئے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے یہ تمام چیزیں غیب کے معنی میں داخل ہیں کیونکہ وحی کا سلسلہ ان سے پوشیدہ ہے۔ دوسرے قول میں "اللہ، اس کے فرشتے، کتابیں، رسول، آخرت کا دن، جنت، آگ، اللہ سے ملاقات اور موت کے بعد کی زندگی" غیب ہے۔ یہ تمام چیزیں انسانی حواس سے اوجھل ہیں اس لئے یہ غیب کے عموم میں داخل ہیں۔ تیسرے قول میں "قرآن" کو غیب کہا گیا ہے۔ یہ غیب کی ایک مثال ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس کو ہم نے اللہ سے بذات خود نہیں لیا بلکہ نبی کریم ﷺ نے اللہ سے وحی کے ذریعے سے لیا اور پھر ہم تک پہنچا دیا۔ چونکہ وحی ہم سے اوجھل ہے اس لئے یہ بھی غیب کے عموم میں داخل ہے۔ چوتھے قول کے مطابق "اللہ" غیب ہے۔ یہ غیب کا

34۔ ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ج1، ص36

Ibn e Abī Ḥātim, Tafsīr Ibn e Abī Ḥātim,vol-1,p:36

35۔ ایضا

Ibid.

36۔ ایضا

Ibid.

ایک جز ہے۔ چونکہ اللہ انسان کے حواس سے پوشیدہ ہے اس لئے اسے غیب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پانچویں قول میں "اسلام" غیب ہے۔ اسلام، مومنین تک نبی ﷺ کے ذریعے سے پہنچا ہے اور نبی ﷺ تک وحی کے ذریعے پہنچا ہے۔ چونکہ وحی کا سلسلہ مومنین سے اوجھل ہے اس لئے "اسلام" کو غیب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چھٹے قول میں "تقدیر" کو غیب کہا گیا ہے۔ تقدیر بھی انسان کے حواس سے اوجھل ہے۔ چونکہ انسان کو تقدیر کا صحیح ادراک نہیں ہو سکتا اس لئے اس کو غیب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تمام اقوال غیب کے عموم میں داخل ہیں اور اسی کے مختلف اجزاء کو بیان کرتے ہیں۔ مفسرین جب اپنے اپنے انداز میں غیب کا معنی بیان کرتے ہیں، تو ان کا مقصود اس کے معنی کا احاطہ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ دوسرے اقوال کو رد کرتے ہیں بلکہ تمام اقوال غیب کے ہی معنی کو بیان کرتے ہیں۔ پس یہ تمام اقوال ایک ہی معنی کی تعبیر کرتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہیں۔

مثال2:"شَيَاطِينِهِمْ" کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

اللہ تعالیٰ منافقین کے بارے میں قرآن مجید میں فرماتے ہیں۔

﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُون﴾[37]

"اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم بھی ایمان لا چکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو ان سے مذاق کرتے ہیں۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ منافقین کا طرز عمل بیان کر رہے ہیں کہ وہ اپنے شیاطین سے علیحدگی میں ملتے ہیں۔ یہاں پر "شَيَاطِينِهِمْ" کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال وارد ہوئے ہیں۔

1. "شَيَاطِينِهِمْ" سے مراد ان کے یہودی ساتھی ہیں۔ یہ قول حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔[38]
2. اس سے مراد "ان کے مشرک اور منافق ساتھی" ہیں۔ یہ قول مجاہدؒ سے مروی ہے۔[39]

37۔ البقرۃ،14:2

Al Qur'ān,2:14

38۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص306

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī, vol-1, p:306

39۔ ایضا، ص308

Ibid, p:308

3. اس سے مراد "شرک اور برائی میں مبتلا ان کے سرداران" ہیں۔ یہ قول قتادہؒ سے مروی ہے۔[40]

4. اس سے مراد "مشرک لوگ" ہیں۔ یہ قول ربیع بن انسؒ سے مروی ہے۔[41]

5. اس سے مراد "سرداران یہود اور کعب بن اشرف" ہیں۔ یہ قول ابو العالیہؒ سے مروی ہے۔[42]

اختلاف کی حقیقت:

یہ نوعیت کا اختلاف ہے۔ "شیاطین" کا لفظ عام ہے۔ مفسرین نے اس کے مختلف اجزاء بیان کئے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف میں تطبیق:

عربی زبان میں شیطان کا لفظ "شطن" سے بنا ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں۔[43] چونکہ شیطان حق سے دور ہے اور سرکشی میں بہت آگے چلا گیا ہے اس لئے اسے شیطان کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں لفظ "شیاطین" عام ہے۔ اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو حق سے دور ہو اور سرکش ہو چاہے وہ انسان ہو یا جن۔ یہ وہ عام معنی ہے جس کے مختلف اجزاء کو مفسرین نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

پہلے قول کے مطابق "منافقین کے یہودی ساتھی" شیاطین ہیں۔ چونکہ یہ یہودی ساتھی حق سے دور اور سرکش تھے اس لئے انہیں شیطان کہا گیا ہے۔ دوسرے قول کے مطابق "مشرک اور منافق ساتھی" شیاطین ہیں۔ یہ لوگ بھی حق سے دور اور سرکش تھے اس لئے انہیں شیاطین کہا گیا ہے۔ تیسرے قول میں "شرک اور برائی میں مبتلا منافقین کے سرداران" شیاطین ہیں۔ یہ لوگ بھی حق سے دور اور سرکش تھے، اس لئے انہیں بھی شیطان کہا گیا ہے۔ چوتھے قول کے مطابق "مشرک لوگ" شیاطین ہیں۔ یہ مشرک لوگ حق سے دور تھے اس لئے ان کو شیاطین

---

[40]۔ اطبری، تفسیر طبری، ج1، ص307

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī, vol-1, p:307

[41]۔ ایضا، ص308

Ibid, p:308

[42]۔ ایضا، ص48

Ibid, p:48

43۔ راغب اصفہانی، مفردات فی غریب القرآن، ص568

Rāghib Asfahānī, al-Mufradāt Fi Gharīb Al-Qur'ān, p. 568

کہا گیا ہے۔ پانچویں قول میں "سرداران یہود اور کعب بن اشرف "شیاطین ہیں۔ یہ لوگ بھی حق سے دور اور سرکش تھے اس لئے انہیں بھی شیاطین کہا گیا ہے۔

ان تمام اقوال میں مفسرین نے "شیاطین" کے عموم کے مختلف اجزاء کو بیان کیا ہے۔ اس سے ان کا مقصد اس عموم کا احاطہ نہیں ہے بلکہ انہوں نے مثال کے لئے بعض کو شیاطین قرار دیا ہے۔ یہ تمام اقوال ایک ہی عام معنی کی تعبیر کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک قول دوسرے اقوال کی نفی نہیں کرتا، لہذا ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

مثال3:" الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو علم عطا فرمایا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾[44] "اور آدم کو (اللہ نے) تمام نام سکھا دیئے۔"

اس آیت میں "الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" کی تفسیر میں مختلف اقوال وارد ہوئے ہیں:

1. پہلا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام سکھا دیا۔ یہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔[45]
2. " الْأَسْمَاءَ "سے مراد "فرشتوں" کے نام ہیں۔ یہ قول ربیعؒ سے مروی ہے۔[46]
3. اس سے مراد "حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے تمام نام "ہیں۔ یہ قول ابن زیدؒ سے مروی ہے۔[47]
4. اس سے مراد "ستاروں کے نام "ہیں۔ یہ قول حمید الشامیؒ سے مروی ہے۔[48]

44۔ البقرہ، 31:2

Al Qur'ān,2:31

[45]۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص516

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī, vol -1,p:516

[46]۔ ایضا، ص517

Ibid,p:517

[47]۔ ایضا، ص518

Ibid,p:518

اختلاف کی حقیقت:

یہ اختلاف نوعیت کا ہے۔ "الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" میں عموم پایا جاتا ہے۔ مختلف مفسرین نے اس عموم کے مختلف اجزاء بیان کئے ہیں، سب کا مقصود ایک ہے۔ ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف میں تطبیق:

یہاں پر " الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" میں عموم پایا جاتا ہے کہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام نام سکھا دیئے۔ مختلف مفسرین نے اس عموم کے مختلف اجزاء بیان کئے ہیں۔ پہلے قول میں اسی عموم کے مطابق تفسیر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا علم سکھا دیا۔ باقی تینوں اقوال میں اس عام کے بعض اجزاء بیان کئے گئے ہیں۔ فرشتوں کے نام، حضرت آدمؑ کی اولاد کے نام، اور ستاروں کے نام، اسی عموم میں داخل ہیں۔ ان مفسرین کا مقصد عموم کا احاطہ نہیں ہے بلکہ انہوں نے اس عموم کے بعض اجزاء کو بیان کیا ہے۔ پس یہ تمام اقوال ایک ہی عموم میں داخل ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے لہذا ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

مثال4: "نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ" کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعمت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾[49]

"اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی۔"

اس آیت میں نعمت کی تفسیر میں کئی اقوال وارد ہوئے ہیں:

1. نعمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون اور اس کی قوم سے نجات دی۔ یہ قول حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔[50]

---

[48] ۔ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ج1، ص80

Ibn e Abī Ḥātim, Tafsīr Ibn e Abī Ḥātim, vol -1,p:80

[49] ۔البقرہ، 40:2

Al Qur'ān,2:40

[50] ۔طبری، تفسیر طبری، ج1، ص595

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol -1,p:595

2. بنی اسرائیل پر اللہ کی یہ نعمت ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کیں۔ یہ قول ابو العالیہؒ سے مروی ہے۔[51]

3. اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بعض نعمتوں کا نام لے کر ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان پر نعمتیں ہیں: اللہ نے ان کے لئے پتھروں سے پانی جاری کر دیا، ان پر من وسلوٰی نازل کیا اور انہیں آل فرعون کی غلامی سے نجات دی۔ یہ قول مجاہدؒ سے مروی ہے۔[52]

4. اس سے مراد اللہ کی نعمتیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل نعمت اسلام ہے، باقی نعمتیں اس کے بعد ہیں۔ یہ قول ابن زیدؒ سے مروی ہے۔[53]

اختلاف کی حقیقت:

یہ نوعیت کا اختلاف ہے۔" نِعْمَتِيَ "میں عموم پایا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا تمام اقوال اسی عموم کے اجزاء ہیں۔ ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف میں تطبیق:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو اپنے انعام یاد دلا رہا ہے جو اس نے ان پر کئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر کسی خاص انعام کا ذکر نہیں کیا بلکہ " نِعْمَتِيَ "میں عموم رکھا ہے۔ مذکورہ بالا تمام اقوال اسی نعمت کی مثالیں ہیں۔ پہلے قول میں فرعون اور اس کی قوم سے نجات کو نعمت قرار دیا گیا ہے۔ یہ نعمت کی ایک مثال ہے اور نعمت کے عموم میں داخل ہے۔ دوسرے قول میں بنی اسرائیل میں انبیاء ورسل کا بھیجنا اور ان پر کتابوں کا نزول نعمت ہے۔ یہ بھی نعمت کی مثالیں ہیں اور نعمت کے عموم میں داخل ہیں۔ تیسرے قول میں نعمت کے عموم کے مطابق بنی اسرائیل پر ہونے والی تمام نعمتوں کا ذکر ہے اور مثال کے طور پر بعض کا نام لے کر ذکر کیا ہے۔ چوتھے قول میں بھی عموم کے

---

[51]۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص595

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol -1,p:595

[52]۔ ایضا

Ibid.

[53]۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص595

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol -1,p:595

مطابق تمام نعتوں کا ذکر ہے اور ان میں سے سب سے افضل نعمت اسلام کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ تمام اقوال ایک ہی عموم کے مختلف اجزاء ہیں اور ایک ہی عام معنی کی تعبیر کرتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے لہذا ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

مثال 5: "رِجْزًا" کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

اللہ تعالیٰ کا سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے:

﴿فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُون﴾[54]

"پھر ہم نے ظالموں پر آسمان سے عذاب اتارا کیونکہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔"

اس آیت میں "رِجْزًا" کی تفسیر میں کئی اقوال وارد ہوئے ہیں:

1. اس سے مراد "عذاب" ہے۔ یہ قول حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔[55]
2. اس سے مراد "طاعون" ہے۔ یہ قول ابن زیدؒ سے مروی ہے۔[56]
3. اس سے مراد "طاعون یا پھر سردی" ہے۔ یہ قول شعبیؒ سے مروی ہے۔[57]
4. اس سے مراد "غضب" ہے۔ یہ قول ابو العالیہؒ سے مروی ہے۔[58]

---

[54]۔ البقرہ، 59:2

Al Qur'ān,2:59

[55]۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص730

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol -1,p:730

[56]۔ ایضا، ص730، 731

Ibid,p:730,731

[57]۔ ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ص120

Ibn e Abī Ḥātim, Tafsīr Ibn e Abī Ḥātim, p:120

[58]۔ طبری، تفسیر طبری، ج1، ص730

Ṭabarī, Tafsīr Ṭabarī,vol -1,p:730

اختلاف کی حقیقت:

یہ نوعیت کا اختلاف ہے۔ آیت میں عموم پایا جاتا ہے۔ یہ تمام اقوال ایک ہی عام معنی کے مختلف اجزاء ہیں۔ ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف میں تطبیق:

عربی زبان میں "رجز" کے اصل معنی "اضطراب" کے ہیں۔[59] لیکن اس آیت میں رجز سے مراد "عذاب" ہے۔[60] یہاں پر اس آیت میں عموم ہے۔ اسی عموم کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ عذاب کونسا تھا؟ اس کو اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں کیا۔ مفسرین نے اسی عموم کو مختلف اقوال کی صورت میں بیان کیا ہے۔ پہلے قول میں اس کو "عذاب" سے تعبیر کیا ہے اور اس میں عموم کا خیال رکھا گیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے قول میں اسے "طاعون" اور "سردی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ عذاب کی مثالیں ہیں۔ یہ بھی عام عذاب کے بعض اجزاء ہیں۔ چوتھے قول میں اسے "اللہ کے غضب" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ کا غضب عذاب کی ہی ایک صورت ہے۔ اس طرح سے یہ تمام اقوال عمومی معنی کے مختلف اجزاء ہیں۔ یہ سب ایک ہی عمومی معنی کی تعبیر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے لہذا ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف تنوع میں تطبیق کی تیسری صورت: ایک ہی چیز کے ایک سے زیادہ معانی بیان کرنا

اختلاف تنوع میں بعض اوقات ایک ہی آیت یا لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوتے ہیں۔ یہ معانی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان کوئی تضاد یا تعارض نہیں ہوتا جیسا کہ مشترک لفظ میں ہوتا ہے۔ ایک مفسر اس کے ایک معنی کے اعتبار سے تفسیر کرتا ہے، تو دوسرا مفسر اس کے دوسرے معنی کے اعتبار سے تفسیر کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی تفسیر میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔

59۔ راغب اصفہانی، مفردات القرآن، ص187

Rāghib Asfahāni, Mufradāt-al-Qur'ān.p 187

60۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز، تحقیق، عبد السلام عبد الشافی، دار الکتب علمیہ، بیروت، لبنان، طبع اول، 2001ء، 1/151

Ibn e 'Atiyah, al-Muḥarir al-Wajīz, Taḥqīq, Abdul Salām Abdul Shafī, , Beirūt: Dār al-Kutub al-'Ilmiyyah, Lebanon, First Edition, 2001.ad, Vol: 1, P: 151

مثال:" خَلِيفَةً" کے تفسیری اختلاف میں تطبیق

اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾[61]

"اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

اس آیت میں "خَلِيفَةً" کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ اس میں درج ذیل اقوال وارد ہوئے ہیں:

1. پہلا قول یہ ہے کہ خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے زمین پر جن آباد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر آباد کیا۔ یہ قول حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔[62]
2. دوسرا قول یہ ہے کہ خلیفہ سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنا نائب بنایا کہ وہ اللہ کی طرف سے اس کی مخلوق میں اس کے احکام کی تنفیذ کرے۔ یہ قول حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے۔[63]
3. خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے کہ ان میں سے بعض، بعض کے جانشین ہوں گے۔ یہ قول حسنؒ سے مروی ہے۔[64]

---

[61]۔ البقرہ، 30:2

Al Qur'ān,2:30

[62]۔ الرازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، دار الفکر، بیروت، طبع اول، 1981ء، 2/180، 181

Al-Rāzī, Fakhr-ud-Dīn, Mafātīḥ-al-Ghayb, Dār al-Fikr, Beirūt, 1st edition, 1981.ad, vol.2, p.180,181

[63]۔ ایضا

Ibid

[64]۔ ایضا

Ibid

اختلاف کی حقیقت:

یہ نوعیت کا اختلاف ہے۔ اس میں ایک ہی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی بیان ہوئے ہیں لیکن ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

اختلاف میں تطبیق:

عربی زبان میں "خلیفہ" کے معنی "بعد میں آنے والا، جانشین اور نائب" کے ہیں۔[65] آیت کی تفسیر میں مذکورہ بالا تمام اقوال خلیفہ کے ان لغوی معانی کے مطابق ہیں۔ یہ سب اقوال اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ ان کی لغت اور قرآن سے تائید ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی لغت یا قرآن کے خلاف نہیں ہے۔ پہلے دو اقوال میں خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہی مراد ہیں۔ اس کے بعد اس کی تاویل میں فرق ہے۔ پہلے قول کے مطابق آیت کی تاویل یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے زمین پر جن آباد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر آباد کیا۔ یہ خلیفہ کے لغوی معنی "بعد میں آنے والا" کے مطابق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر آباد کیا۔ اس کی تائید فرشتوں کے اس قول سے ہوتی ہے:

﴿قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا﴾[66]

"(فرشتوں) نے کہا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس میں فساد کرے؟"

اس آیت میں فرشتوں نے کہا کہ انسان زمین میں فساد کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان سے پہلے زمین پر 'جن' آباد تھے۔ انہوں نے زمین میں فساد کیا۔ فرشتوں نے جب ان کا فساد دیکھا تو کہا کہ انسان بھی فساد کرے گا۔ لہذا آیت سے پتا چلتا ہے کہ زمین پر حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے جن آباد تھے اور ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر آباد کیا۔ دوسرے قول میں خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور آیت کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنا نائب بنایا کہ وہ اللہ کی طرف سے اس کی مخلوق میں اس کے احکام

65۔ راغب اصفہانی، مفردات فی غریب القرآن، ص155، 156

Rāghib Asfahānī,Mufradāt al-Qur'ān, p.155, 156

66۔ البقرہ، 30:2

Al Qur'ān,2:30

کی تنفیذ کرے۔ یہ معنی خلیفہ کے لغوی معنی "نائب" کے مطابق ہے۔ اس کی مزید تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

﴿يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى﴾[67]

"اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنا دیا۔ تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنا خلیفہ یعنی نائب، بنانے کے بارے میں خبر دی ہے اور انہیں زمین پر حق کے ساتھ فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں پر خلیفہ کا مفہوم اللہ کے نائب کا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے میں بھی یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ لہذا دوسرا قول بھی درست ہے۔

تیسرے قول میں خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے کہ ان میں سے بعض، بعض کے جانشین ہوں گے۔ یہ معنی خلیفہ کے لغوی معنی "جانشین" کے مطابق ہے۔ اس کی مزید تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوتی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ﴾[68] "وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اس نے انسان یعنی آدم علیہ السلام کی اولاد کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا۔ لہذا خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے۔ پس تیسرا قول بھی درست ہے۔

یہ تینوں اقوال درست ہیں۔ پہلے دو اقوال میں خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، بس تاویل کا فرق ہے۔ ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔ تیسرے قول میں خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے۔ اس طرح سے تین مختلف معانی بیان ہوئے ہیں، لیکن ان تینوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔ اگر ان تینوں اقوال کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان تینوں میں "خلیفہ" سے مراد 'انسان' ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام بھی انسان اور ان کی اولاد بھی انسان ہیں۔ اللہ بھی اس آیت میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں زمین میں ایک انسان بنانے والا

---

[67] ۔ص، 26:38

Al Qur'ān,38:26

[68] ۔الانعام، 165:6

Al Qur'ān,6:165

ہوں اور وہ انسان، آدمؑ اور اس کی اولاد ہیں۔ اس طرح سے ان تینوں اقوال مین کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہ سب اقوال درست ہیں اور خلیفہ کے معنی کی تعبیر کرتے ہیں۔

خلاصہ بحث

اس بحث کا خلاصہ چند نکات کی صورت میں درج ذیل ہے:

1. تفسیری اختلافات میں تطبیق سے مراد یہ ہے کہ تفسیر میں پائے جانے والے مختلف اقوال و آراء کے درمیان مطابقت و موافقت پیدا کی جائے اور ان کے درمیان موجود اختلاف کو حل کیا جائے۔
2. تنوع کے اختلافات کے درمیان تطبیق ممکن ہے۔
3. تفسیری اختلافات میں تطبیق کی ایک ممکنہ صورت، تعبیرات کا اختلاف ہے۔ مفسرین ایک ہی لفظ کی تفسیر میں مختلف الفاظ اور تعبیرات استعمال کرتے ہیں۔ ایک مفسر ایک تعبیر استعمال کرتا ہے، تو دوسرا مفسر دوسری تعبیر استعمال کرتا ہے۔ سب کا مقصود ایک ہی چیز ہے یعنی سب ایک ہی معنی بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں.
4. تفسیری اختلافات میں تطبیق کی دوسری ممکنہ صورت، ایک ہی 'عام' کے مختلف اجزاء کو بیان کرنا ہے۔ بعض اوقات قرآن مجید میں ایک لفظ "عام" استعمال ہوتا ہے یا کسی آیت میں عموم پایا جاتا ہے۔ مفسرین اس عموم کی مختلف انداز سے تفسیر کرتے ہیں۔ بعض مفسرین عموم کے ایک جز کو بیان کرتے ہیں، تو بعض دوسرے اجزاء کو بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کی غرض دوسرے کی نفی کرنا نہیں ہوتا۔ اس طرح سے اس عام کی تفسیر میں موجود اقوال ایک ہی عام معنی بیان کر رہے ہوتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہوتا۔
5. تفسیری اختلافات میں تطبیق کی تیسری ممکنہ صورت، اختلاف تنوع میں ایک ہی چیز کے ایک سے زیادہ معانی ہیں۔ اختلاف تنوع میں بعض اوقات ایک ہی آیت یا لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوتے ہیں۔ یہ معانی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان کوئی تضاد یا تعارض نہیں ہوتا۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License